روشنی مل گئی

مائل خیر آبادی

کایاپلٹ

"ارے او بھُلنے !"

سعید جاتے جاتے مڑا۔ "جی امی جان!" وہ انوری کے پاس آ گیا۔ "کیا بھول گیا میں؟"

"دلہن کی کنڈیا گھر ہی رہ گئی۔ جا، جلدی سے لے آ۔ شام تک یہاں ٹھہرنا ہے۔ منے کے کچھنے وچھنے اسی میں ہیں۔"

"ابھی لایا امی!" سعید یہ جا وہ جا۔ سائیکل پر بیٹھ اڑن چھو ہو گیا۔ ابھی انوری کے منہ کا پان منہ ہی میں تھا کہ وہ کنڈیا لے کر آ گیا۔

"امی! اور کچھ؟"

"ہاں! یہ پیسے لے۔ پنیر والے بسکٹ لے آ منے کے لئے۔"

سعید پیسے لے کر بازار گیا۔ بسکٹ لے آیا۔ اب انوری نے ایک نسخہ تھما دیا اور کہا۔ "دوڑ کر جا۔ میرے لئے گولیاں لے آ۔"

"اب تو میں سعید کو بے چارا ہی کہوں گی۔ ہاں وہ بے چارا گیا اور گولیاں بھی لے آیا۔ ماں کو دیں اور منتظر رہا کہ انوری اُسے کچھ اور حکم دے۔ میں جل گئی۔ انوری کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ میں نے کہا۔ "اب سعید سے دس بیس گھڑے پانی بھی بھروا لے۔ کیا سعید کے پیروں میں بلّی باندھ کر لائی ہے۔ بار بار دوڑا رہی ہے۔ جا بیٹے

جا۔ شکیل کے پاس بیٹھ جا کر!"

پھر میں نے انوری سے کہا۔ "یہ وہی سعید ہے جس سے تو دن رات نالاں رہتی تھی۔ وہ تیری بات اس کان سنتا اور اس کان اڑا دیتا تھا۔ اب کیا جادو کر دیا۔ اس سے زیادہ سعید بیٹا تو کہیں نظر نہیں آتا۔"

یہ جو میں نے انوری سے کہا تو وہ خوش ہونے کے بدلے کسی قدر اداس ہو گئی۔ آنکھیں بھر گئیں تھیں۔ اس نے انگلی پھیری تو اس کی انگلی پر قطرے پھیل گئے تھے۔ کہنے لگی:

"باجی وہ جو تمہارے بھولے شاہ تھے نا! اللہ ان کو کروٹ کروٹ سُکھ چین بخشے۔ جب تک زندہ رہے۔ بیٹے کو لاڈ پیار میں نکمّا اور ڈھیٹ بنا دیا تھا۔ تم کو تو سب سناتی رہتی تھی۔ یاد تو ہو گا، ایک دن دس بجے تک سعید گھر نہ آیا تھا۔ میں بک جھک رہی تھی۔ وہ ہاں باجی! آپ کے بھولے شاہ صاحب تشریف لائے۔ میری بک جھک سن کر سمجھ گئے کہ سعید ابھی تک نہیں آیا ہے۔ بولے: "کیوں اپنی زبان خراب کرتی ہو ذرا صبر کرو۔ آنے دو نالائق کو۔ آج ہاتھ پیر توڑ کر رکھ دوں گا۔"

باجی ہنسی آتی ہے۔ آپ بھی سن کر ہنسی تھیں۔ اور اسی دن تو آپ نے انھیں بھولے شاہ کا لقب عطا فرمایا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد سعید آیا تو ان حضرت نے سعید کو بلایا۔ بڑے پیار سے بٹھایا۔ ملاحظہ ہو، یہ ہاتھ پیر توڑے جا رہے ہیں۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ فرمایا: "بیٹے آج بڑی دیر لگا دی۔ تمہاری امی بہت پریشان تھیں۔ بیٹے! تم دیر کرتے ہو تو وہ تمہاری محبت میں پاگل سی ہو جاتی ہیں۔ کہنے لگتی ہیں: نہ جانے سعید کو

کیا ہوگیا۔ اگر ذرا دیر اور نہ آتے تو مجھے بھیجتیں کہ ڈھونڈ لاؤ۔"

سعید ہنس دیا اور جا کر سو رہا۔ تمہارے بھولے شاہ صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ "اب جلد آیا کرے گا۔"

"ہاں آیا تو کرے گا۔ لاڈ پیار میں لونڈے کو خراب کئے دیتے ہو کچھ تو ڈانٹ دیا کرو۔"

"اچھا خیر! اب تو وہ سو گیا۔ کل ڈانٹ دوں گا۔ میں نے تو اس خیال سے سخت سست نہیں کہا کہ تم کو دُکھ ہوگا۔"

"یہ ہوگئی ایک بات! اور سنئے! ایک دن سنیما دیکھنے چلا گیا۔ اس دن تو میں نے کنڈی لگا لی اور طے کر لیا کہ نہ کھولوں گی۔ گیارہ بجے آیا۔ باہر کی کنڈی بجائی۔ میں سوتی بن گئی۔ پھر کنڈی بجی۔ پھر بجی۔ میں نہ اٹھی تو حضرت بھولے شاہ چپکے سے اٹھے۔ میں نے کہا: "کہاں چلے؟" بولے: "آج ذرا دو ایک ہاتھ لگا دوں۔ اب تو اس نے بہت پیر نکالے ہیں۔"

میں بھی پیچھے چلی۔ بھولے شاہ کے چہرے پر غصہ کے آثار سچ مچ تھے۔ میں سوچی۔ کہیں ایسا نہ ہو آج پیٹ ہی دیں۔ میں پیچھے چلی۔ انھوں نے کنڈی کھولی۔ سعید اندر آیا۔ سنتی ہو باجی! تمہارے بھولے میاں نے کیا کہا اس سے؟ "بُری بات ہے سنیما دیکھنا۔ بس آج ہوگیا۔ اب توبہ کرو۔" دیکھا آپ نے یہ تھا ان کا لاڈ پیار۔

اس سلسلے میں بڑے واقعات ہیں۔ ایک بار تو حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ یاد ہے نا! اسکول میں اپنے کسی ساتھی پر چاقو نکال لیا تھا۔ وہ تو کہئے۔ ڈرل ماسٹر نے دوڑ کر چھین

لیا ورنہ خدا جانے کیا ہو جاتا۔ یہ خبر پہنچی۔ میں بدحواس ہو گئی۔ وہ کھانا کھا رہے تھے۔ کھانا بھول۔ اٹھ کر بھاگے۔ مجھ سے کہا کہ ''آج اس لونڈے کی بوٹیاں اڑا دوں گا۔''

اب سنئے! سنئے کیا۔ آپ بھی تو میرے گھر آ گئی تھیں۔ آپ نے دیکھا تھا کہ کس طرح سعید کی بوٹیاں اڑائی تھیں۔ جیسے ہی گھر آئے۔ باجی السلام علیکم کہہ کر بولے: ''بالکل ناسمجھ ہے۔'' پھر مجھ سے کہا: ''وہ جو میں مٹھائی لایا تھا ذرا سعید کو دے دو۔ بہت بھوکا ہے۔ دیکھو تو چہرہ اترا اترا لگتا ہے۔'' میں بھُن کر رہ گئی۔ باجی تم نے بھی کہا تھا: ''حشمت میاں! تم لاڈ پیار میں لونڈے کو خراب کر دو گے۔''

''باجی آج میں نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا ہے اب وہ اسم بامسمّٰی بن جائے گا۔''

''خاک منہ میں! خود شیطان بنا رہے ہیں۔ وہ اسم بامسمّٰی بنے گا۔ گھر میں رہو تو پتہ چلے۔ دن بھر وہ اُودھم مچاتا اور بھوبھل جوتتا ہے کہ خدا کی پناہ۔ مر بھی نہیں جاتا کمبخت!''

''توبہ کرو بیگم۔ باجی آپ سعید میاں کی ماں کو سمجھائیں۔ کیسا کلمہ منہ سے نکال دیا۔ توبہ توبہ۔''

اس طرح عمر بھر بیٹے کی طرفداری کرتے رہے۔ وہ ڈھیٹ ہوتا رہا۔ محلے میں روز شکایتیں سننے میں آتیں۔ آج اس سے لڑا۔ کل اسے پیٹا۔ پرسوں کہیں سے پٹ کر آیا۔ کہیں کرتہ پھٹا۔ کہیں پائجامہ نچوا کر آیا۔ آج ٹوپی غائب، روز روز قلم دوات کاپی کے لئے پیسوں کا تقاضا۔ میں تو بیزار ہو گئی۔ کبھی کوئی کام کر کے نہ دیا۔ حد یہ ہو گئی کہ جب وہ بیمار ہوئے تو بھی اس کی آنکھیں نہ کھلیں۔ حکیم ڈاکٹر سے دوا لینے میں جاتی۔

اسے کوئی غم ہی نہیں۔ باپ سے کبھی نہ پوچھا کہ کیا حال ہے؟ شاید وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ مرے گا ہی نہیں۔ لیکن اس بیماری سے باپ نہ اُٹھ سکا۔ میں نے لاکھ دوا دارو کی۔ سینکڑوں روپیہ اٹھا ڈالا۔ ایک دن مجھے پاس بلایا۔ بولے: ''اب صبر کرو، دوا دارو ختم کرو، ایسا لگتا ہے کہ آخری وقت ہے۔ سعید کو بلاؤ۔''

میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ آنسو پونچھ کر اٹھی۔ نجمن کو بلانے بھیجا۔ نالائق نہ جانے کس سے لڑا تھا۔ سارے کپڑے کسی نالی کے گندے پانی سے لت پت آیا۔ ''کیا ہے کیا؟ ذرا دیر کے لئے باہر گیا تھا کہ بلا لیا۔'' میں نے کہا: ''بیٹا! کبھی تو آدمی بن جاؤ۔ تمہارے ابّا اللہ میاں کے یہاں جا رہے ہیں۔ تم کو بلایا ہے۔'' باجی تم بھی تو آ گئی تھیں۔ تمہارے سامنے سعید باپ کے پاس اٹھارہ برس میں پہلی بار خاموشی سے آیا۔ انھوں نے دیکھا۔ ہاتھ کے اشارے سے پاس بلایا۔ سانس تقریباً اکھڑ چکی تھی۔ بڑی مشکل سے یہ جملہ نکلا: ''بیٹا! ماں کو ناراض نہ کرنا۔ جنت ماں کے...... یہ جملہ پورا نہ ہو سکا اور سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

کہرام مچ گیا۔ گھر میں وہ پہلا دن تھا کہ سعید چپ دیکھا گیا۔ سب ہائے ہائے کر رہے تھے۔ رو رہے تھے۔ آنسو بہا رہے تھے۔ وہ گم صم، نہ ہائے وائے، نہ آنسو۔ آسمان کی طرف نظر اٹھ گئی تو ادھر ٹکٹکی بندھ گئی۔ کسی اور طرف دیکھا تو اُدھر ہی دیکھتا رہا۔ جنازہ اٹھا۔ اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ باجی تم نے ڈانٹا تھا۔ ''نالائق! جنازے میں تو شریک ہو لے۔'' کچھ کہے بنا چلا گیا۔ چلا بھی آیا۔ آ کر اپنی چارپائی پر گرا۔ ایک بار ''ہائے'' اس کی زبان سے نکلا اور پھر گم صم۔ تم بھی گھبرا گئی تھیں، میں بھی۔ اور جو لوگ

تھے وہ بھی دوڑ پڑے۔ ڈاکٹر بلا لیا گیا۔ اس نے دیکھا۔

''سخت صدمہ دل پر پہنچا ہے۔ خیر میں تدبیر کرتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے انجکشن لگایا۔ کچھ گولیاں دے گیا اور فیس لے کر چلا گیا۔ اب ہمیں اور آپ کو سعید کے لالے تھے۔ بڑی دعاؤں کے بعد خیر صبح تک ٹھیک ہو گیا۔

باجی! عالم الغیب تو اللہ ہے۔ میں کچھ نہ سمجھ سکی۔ کیسے کیا ہوا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن۔ میرے کولھے سے کولھا ملائے بیٹھا رہتا ہے۔ ہر وقت گھر کا کام دھام یا پڑھنا لکھنا۔ ابھی بازار سے آٹا لایا، ابھی نمک۔ بار بار، بار بار کہیں دوڑا لو۔ کبھی نہیں، نہیں کی۔ ہر وقت میری نگاہیں دیکھتا رہتا ہے۔ ذرا کسی طرف اشارہ کیا، تیر کی طرح پہنچا۔ ذرا دیر کی کہیں اور میری نظروں میں غصہ دیکھا۔ تو یہ تِلاّ شروع کر دی۔ امی! معاف کر دو۔ اب جلدی آیا کروں گا۔ راشن ڈپو پر لائن لگی تھی۔ یوں دیر ہو گئی۔ باجی! جانے کیسے سعید سچ مچ سعید ہو گیا۔ گھر گھر چرچے ہونے لگے۔ ارے سعید تو نمازی ہو گیا۔ ارے سعید نے روزے رکھے۔ ارے واہ! سعید کیسا سعید بیٹا نکلا۔

اس سال تھرڈ ایئر میں فرسٹ آیا۔ انعام لیا۔ اس کے محنتی ہونے با اخلاق ہونے اور کام کا جی ہونے کی دھوم مچ گئی۔ انیسویں برس میں تھا کہ ابھی سے پیغام آنے لگے۔ تم نے بھی کہا، کر بھی دو، گھر خالی خالی ہے۔ یہ کیا بیٹھی ہے۔ اری دلہن، ادھر دیکھ، منے کو مجھے دے۔ ذرا اپنی خالہ اور میرے لئے پان بنا لا۔ اور آج ہی تم نے دیکھ لیا۔ کتنی بار دوڑا۔ تم کو بھی ترس آ گیا۔ اس سے پوچھو! دلہن بتائے گی۔ کبھی ''ہونہہ'' تک دلہن کو نہ کہی۔ بس اتنا میں نے کہہ دیا تھا: ''سعید! میں دلہن کو بیاہ لائی ہوں۔ مجھے رسوا نہ

کرنا۔" باجی! دلہن کہتی ہے کہ دلہن تو منے کے ابا ہیں اور میں شوہر ہوں۔" روز ایک نہ ایک بات سناتی ہے اور ہنستی ہے۔ بہت خوش ہے باجی آپ کی دلہن۔ میرا دل باغ باغ ہے۔ ہاں! اس دن ذرا روئی تھی جب مجھے بخار آ گیا۔ رات بھر مجھے نیند نہ آئی ...... سعید دیوانوں کی طرح میری چارپائی کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ دلہن میرا سر دبا رہی تھی۔ پھر جب میں سوگئی تو وہ میرے پیروں کی انگلیاں دبا رہا تھا۔ نیند لگی تو وہ سو گیا۔ جب میں جاگی تو میرا پیر اس کے سینے پر تھا اور اس کے ہاتھوں میں میرے پاؤں کی انگلیاں۔ باجی! میں سمجھتی ہوں کہ نصیحت کا اثر ہوتا ضرور ہے۔ تم انھیں بھولے شاہ کہتی تھیں۔ یہ تو ان سے بڑھ کر بھولا ہو گیا۔ ان کی زندگی میں تو بن نہ سکا۔ وہ تو اللہ کو پیارے ہو گئے اور سعید کو اللہ کا پیارا بنا گئے اور کیا عرض کروں۔ میں تو یہی سمجھ سکی ہوں۔

باجی کی زبان سے نکلا:

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ "یہی اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے، دیتا ہے۔"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ مجھے وہ یاد آ رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ آنسو ان کی یاد میں نکلے یا سعید کی سعادت مندی کی خوشی کے تھے۔

☆☆☆

میری ساس

"ہائے امی! بھابی نے پلیٹ توڑ دی۔"

ننھی فاطمہ زور سے چلاّئی۔ اور میرا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ میری شادی کو ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ خدمت کے جوش میں اور ساس کو خوش کرنے کے لئے میں نے گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ میری ساس مجھے روکتیں۔ بیٹی! اللہ تجھے جیتا رکھے۔ اللہ تیرا سہاگ قائم رکھے۔ اللہ تجھے اس گھر کی رونق بنائے۔ ابھی تجھے آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اور کام میں جٹ گئی۔ لیکن میرا یہ حال کہ جتنا ہی وہ منع کرتیں اتنا ہی میں زیادہ کام کرتی۔

مجھ سے میرے میکے کے بزرگوں نے کہہ دیا تھا کہ سلمٰی بیٹی! ''ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد۔'' خدمت ہی سے عظمت ہے۔ بس میں اسی دُھن میں تھی۔ میں کوئی کام کرنے لگتی تو ساس مجھ سے چھین لیتیں۔ میں دوسرا کام لے بیٹھتی۔ ایک دن میں نے برتن دھونا شروع کر دیئے۔ فاطمہ بیٹھی مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ پلیٹ چکنی تھی۔ میں نے اٹھائی تو پھسل کر گری اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ ادھر زمین پر تڑاق کی آواز ہوئی۔ اُدھر فاطمہ چلاّئی۔ ''ہائے امی! بھابی نے پلیٹ توڑ دی۔'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ پلیٹ ساس کے جہیز کی ہے۔ جہیز کی چیزیں عورتیں بہت عزیز رکھتی ہیں۔ چاہے وہ ایک پیالی ہی کیوں نہ ہو۔ پھر یہ پلیٹ پرانی چینی کی۔ اب تو ایسی چینی کی پلیٹیں ملتی بھی نہیں۔

میں اسی سوچ میں دم بخود تھی کہ ساس آ گئیں۔ آنکھیں چار ہوئیں تو میری حالت اس چور کی طرح ہو گئی جو موقع واردات پر پکڑا گیا ہو اور اس کو رحم طلب کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہو۔ فاطمہ نے پلیٹ کا ایک ٹکڑا اٹھا کر دکھایا اور پھر شکایت کی کہ

بھابی نے توڑ دیا۔

میری ساس نے ایک نظر مجھے اور فاطمہ کو دیکھا۔ پھر فاطمہ سے کہا: ''بیٹی! تیری بھابی نے توڑا نہیں۔ ان سے ٹوٹ گئی ہے۔'' پھر مجھ سے بولیں:

''بیٹی سلمیٰ! تم روتی کیوں ہو۔ تم سے دھونے میں ٹوٹ گئی۔ میں جب تمہاری عمر کی تھی تو مجھ سے بھی ایسی باتیں ہو جاتی تھیں۔ سب سے ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ کہ پلیٹ چینی کی ہی تو ہے۔ لوہے کی تو ہے نہیں۔ ذرا میں ٹوٹ جاتی ہے۔ تو اس کا وقت آ گیا تھا۔ اچھا بس کرو، آنسو پونچھو۔ ہاتھ منہ دھو ڈالو۔ آؤ، میرے پاس آ کر بیٹھو۔''

میں نے لمبی سانس لی۔ یہ اطمینان کی سانس تھی۔ میں تو سمجھی تھی کہ آج ساس میرے لتّے لے ڈالیں گی۔ لیکن انھوں نے الٹے میری ڈھارس بندھائی۔ میں نے ہاتھ منہ دھویا پھر ساس کے پاس چلی گئی۔ وہ اپنے سہاگ کے واقعات سنانے لگیں۔ واقعات کچھ اس طرح سے سنا رہی تھیں۔ جن میں ان کی بھول چوک کے بھی قصے تھے اور نصیحتیں بھی۔ ان قصّوں میں ایک بڑا ہی دلچسپ اور نصیحت سے بھرا ہوا واقعہ سنایا۔ یہ واقعہ میں آج تک نہیں بھولی۔ میری ساس نے کہا کہ:

''بیٹی سلمیٰ! ہوا یہ کہ میری نئی نئی شادی ہوئی۔ نئی نویلی دلہن گھر کے دوسرے لوگوں کے سامنے تو چپ کا روزہ...... رکھ لیتی ہے۔ لیکن شوہر سے رات بھر باتیں کرتی ہے۔''

میری ساس نے یہ جو کہا تو میرے نہ چاہتے ہوئے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ بولیں: ''اللہ! تیری یہ مسکراہٹ تیرے ہونٹوں پر کھیلتی رکھے۔'' ہے نا بیٹی بات سچی! اچھا تو جب کوئی رات رات بھر باتیں کرے گا تو زبان سے ہر طرح کی باتیں نکل

جائیں گی۔ میری زبان سے ایسی ویسی تو کوئی بات نہ نکلی۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی۔ میری اماں ایسی نیک ہیں۔ میرے ابا ایسے اچھے ہیں۔ میرے بہن بھائی بڑے فرمانبردار ہیں۔ یعنی میں اپنے گھر کی تعریف کر رہی تھی۔

بھلا اس میں تعریف کی ایسی ویسی کیا بات ہے۔ مگر میاں کو، ہاں بیٹی سلمٰی! تمہارے خسر صاحب کو یہی تعریف بُری لگی۔ وہ سمجھے کہ اس انداز سے ان کی ماں باپ کی بُرائی کر رہی ہوں۔ بس دوسرے دن میاں کا منہ پھول گیا۔ اُف فوہ! بولنا چھوڑ دیا۔ کچھ دیر تو مجھے احساس نہیں ہوا۔ پھر جب نو دس بجے وہ کام پر گئے اور مجھ سے نہ بولے تو مجھے بے حد افسوس ہوا۔ انھوں نے اپنی ماں کو تو سلام کیا۔ لیکن میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ اس بات کو میری ساس نے بھی نوٹ کیا۔

کام سے فراغت کے بعد مجھ سے پوچھنے لگیں۔ ''مسعود آج اُداس اُداس کیوں ہے؟'' میں نے جواب دیا: ''امی یہی میں آپ سے پوچھنے والی تھی۔''

''کچھ ہوا ضرور ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی بات اس کی طبیعت کے خلاف تم سے ہو گئی ہے۔''

''نہ امی! میں برابر سوچ رہی ہوں۔ میں تو ان کو برابر خوش کرنے کی بات کرتی رہتی ہوں۔''

''اچھا میں اس سے پوچھوں گی۔''

میں دن بھر بے چین رہی۔ سوچتی رہی کہ آخر مجھ سے کیا خطا ہوئی کہ میاں کی نگاہیں پھر گئیں۔ شام کو آئے تو ماں نے اپنے کمرے میں بلایا سمجھایا۔ بات پوچھی تو

بتایا کہ یہ عورت میرے ماں باپ کی توہین کرتی ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ ہروقت اپنے گھر والوں کی تعریف...... اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہمارے گھر کے لوگ گنوار ہیں۔

اس پر ساس نے سمجھایا۔ ”نہیں بیٹے! اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں۔ ہر نئی نویلی اپنے گھر کی باتیں کرتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔“

یہ سب میری ساس نے مجھے بتایا۔ اب مجھے یہ علم آپ سے آپ ہوا کہ شوہر کتنا حسّاس ہوتا ہے۔ رات میں میں نے اپنی ساس اور خسر کی اچھی باتوں کی تعریف کی تو ایسا لگا جیسے ”عذرِ گناہ بدتر از گناہ“ ہو۔ انھوں نے منہ پھیر لیا۔ ”چپ رہو۔“ کہہ کر لیٹ گئے۔ اب مجھے دوسرا علم ہوا کہ اگر شوہر بات کرنا چھوڑ دے۔ تو یہ بیوی کے لئے ایک بڑی دکھ بھری بات ہوتی ہے۔ میں رات بھر تارے گنتی رہی۔ صبح میں نے ساس سے کہا۔ مجھے تسلی دے کر بولیں: ”غم نہ کر بیٹی! آپ سے آپ تجھ سے بولے گا۔“

”کیسے؟“ یہ کیسے میں نے دل میں کہا اور یہ دیکھتی رہی کہ میاں آپ ہی آپ مجھ سے کیسے بولیں گے۔ ایک دن اور ایک رات ہوگئی اور میں کانٹوں پر لوٹتی رہی۔ تیسرے دن مغرب کے بعد جب ہم سب کھانا کھارہے تھے تو میری ساس نے مسعود صاحب سے پوچھا: ”بیٹے! وہ کیا حدیث ہے؟“ مسعود صاحب ماں کا منہ دیکھنے لگے گویا پوچھ رہے تھے کہ کون سی حدیث ہے؟“

”ارے وہ! جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک مؤمن کے لئے یہ ٹھیک نہیں ہے کہ دوسرے مؤمن سے تین دن کے بعد بھی روٹھا رہے۔“ یہ سننا تھا کہ

وہ مسکرائے۔ میری طرف دیکھا۔ میں بھی مسکرادی۔

''لو۔ بس قصہ ختم۔'' ساس اٹھ کر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی مجھ سے کہا:

''آج کھانا بہت اچھا بنا ہے۔ کس نے پکایا تھا؟'' جانتے تھے کہ میں نے پکایا ہے۔ میں اپنی تعریف محسوس کر کے بہت خوش ہوئی۔ اور پھر میل ہو گیا۔ اس ملاپ میں مجھے شاعر کے اس مصرع کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑا جس نے کہا ہے کہ:

''بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے، کہ صلح ہو جائے جنگ ہو کر''

مگر اب میں یہ سوچ رہی تھی کہ یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے دوسرے دن ساس سے پوچھا: ''امی! آپ نے کیا جادو کر دیا ان پر؟''

بولیں: '' کچھ نہیں بیٹی! اللہ کا فضل ہے کہ مسعود مسلمان ہے۔ نام کا مسلمان نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہے تو صرف یہی نہیں کہ نماز روزے کی حد تک مسلمان ہو۔ بات بات میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان بھول جاتا ہے۔ یاد دلانے کی ضرورت ہے۔ میں نے پیارے نبیؐ کی یاد اسے دلائی اور وہ تم سے آپ سے راضی ہو گیا۔ اور تین دن پورے نہ ہوئے کہ تم سے خود بولا۔''

''امی!......'' میں نے بڑھ کر ساس کا دامن چوم لیا۔ انھوں نے میرے سر پر بڑی ممتا سے ہاتھ پھیرا۔ جب تک میں سر جھکائے رہی۔ وہ مجھے دعائیں دیتی رہیں۔ میں نے عرض کیا کہ '' مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ میں نے اسکولی تعلیم تو حاصل کر لی۔ مگر رہی نام کی مسلمان۔ کام کی مسلمان کیسے بنوں؟''

''میری بھنّو!......'' ساس بڑے پیار سے بولیں: ''تو یہ کوئی بڑا کام تھوڑے ہی ہے۔ گھر میں ہر طرح کی کتابیں ہیں پڑھو اور عمل کرو۔''

میں نے اسی دن سے مطالعہ شروع کر دیا۔ مجھے روشنی ملنے لگی۔ میں اندھیرے میں تھی۔ اجالے میں آئی۔ اب میں تم کو بتاؤں۔ یہ پلیٹ جو اچانک تم سے ٹوٹ گئی۔ میں اسے سنبھال کر رکھ رہی تھی۔ اس کے ٹوٹنے کا مجھے دکھ تو ہوا مگر میں نے پیارے رسولؐ کی وہ حدیث پڑھی ہے جس میں حضرت انسؓ نے کہا کہ میں پیارے رسولؐ کی خدمت میں بچپن سے رہا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہ نہ کہا کہ تو نے ایسا کیوں کیا، ویسا کیوں کیا؟''

''تو بیٹی! ایسا کیوں ویسا کیوں ہی سے تو بات بگڑتی ہے۔ میں ایک پلیٹ کے کارن تمہارا دل توڑ کر پیارے رسولؐ کی نافرمانی کیوں کرتی؟ ٹھیک کیا نا میں نے؟''

آپ سے آپ میری زبان سے نکلا۔ ''امی! بڑی اچھی ہیں آپ۔''

اسی طرح کی اور بہت سی باتیں میں نے اپنی ساس کی نوٹ کیں۔ ایک دن گوالا دودھ دے گیا۔ میں چولھے پر گرم کرنے چلی تو دودھ گر گیا۔ ننھی فاطمہ میری نند نے آج بھی دیکھا۔ لیکن اس نے اس وقت یہ نہیں کہا کہ امی دوڑو، بھابی نے دودھ پھینک دیا۔ اس کی زبان سے نکلا۔ امی دودھ گر گیا۔ میں نے صاف صاف امی سے کہہ دیا۔ آج میری غلطی سے دودھ گر گیا۔ ''اور آ جائے گا'' کہہ کر لڑکے کو دوڑا دیا۔ وہ دودھ لے آیا۔ میں دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ آج بھی امی کوئی معرکے کی بات بتائیں گی۔ سچ مچ انھوں نے ایسی بات نکالی کہ میں جھوم گئی۔ فرمایا: ''بیٹی! میرا خیال ہے کہ

اس دودھ میں کوئی نقص آ گیا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ ہم اسے کام میں لاتے اور اس کے نقص سے کسی بیماری میں پھنس جاتے تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے بچالیا اور اپنے فرشتوں سے دودھ گروادیا۔''

''یا اللہ! امی! آپ اتنی اونچی ہیں۔'' میری زبان سے نکلا۔''ایسی ساسیں آج کل کہاں ہوتی ہیں؟'' دوسری ساسیں تو بہو کی غلطیوں پر آگ بگولہ ہو جاتی ہیں۔ بہو کو کوستی ہیں۔ بہو کے گھر والوں کو کوستی ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی۔''میرے مالک! تو نے مجھے جیسی ساس عطا فرمائی ہیں۔ ایسی ہی سب ساسیں بنا دے۔ میں سوچا کرتی کہ میکے میں، میں کیسی منہ پھٹ تھی۔ اپنی سگی ماں سے بدتمیزی کر بیٹھتی تھی۔ توبہ توبہ! ابا جان کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اگر کہیں میرا مزاج یہاں بھی وہی کام کرتا اور کرنے کی بات ہی کیا۔ ضرور کرتا۔ لیکن میری ساس نے میرے اس مزاج کو چیلنج ہی نہیں کیا۔ وہ تو یہاں دبا کا دبا رہا۔ بتاؤں وہ کیسے دبا؟ بات یہ ہوئی کہ ایک دن مسعود صاحب کی خالہ آئیں۔ وہ ذرا چھوٹے قد کی تھیں۔ میں انھیں دیکھ کر مسکرادی۔ خالہ سمجھیں سلمیٰ خوش میں مسکرائیں۔ لیکن ساس نے بھانپ لیا۔ جب خالہ چلی گئیں تو پوچھا: ''کیوں مسکرائی تھیں۔'' جی میں آیا کہ جھوٹ بول دوں۔ لیکن میری ساس کے برتاؤ نے مجھے اس قابل کب چھوڑا تھا کہ جھوٹ بول سکتی۔ میں نے کسی ڈر کے بغیر سچ سچ کہہ دیا: ''امی! خالہ جان تو اتنی سی ہیں۔ بالکل ٹھنگنی!''

اب سنئے میری ساس نے اس پر کیا کہا۔ کہا نہیں۔ فرمایا: ''بیٹی! جب تم مسکرائی تھیں۔ تب ہی میں سمجھ گئی تھی کہ تم نے میری بہن کو ہیچ سمجھا۔ تو بیٹی! شکل وصورت اور

ڈیل ڈول تو اللہ بناتا ہے۔ اگر اس پر کوئی ہنسے تو یہ تو اللہ پر بات ماری اس نے۔"

یہ سنتے ہی میرا دل کانپ گیا۔ "توبہ امی!" میری زبان سے نکلا۔ کہنے لگیں:

"ہاں بیٹی! ایک واقعہ سناؤں۔ ایک بار پیارے رسولؐ کی پیاری بیوی ام المؤمنین حضرت عائشہؓ نے حضورؐ سے کہا کہ صفیہ! تو اِتّی سی ہیں ٹھنگنی۔ یہ سن کر حضورؐ نے نصیحت کی۔ عائشہ! تم نے ایسی بات کہی کہ اگر یہ سمندر میں ڈال دی جائے تو اس کا سارا پانی کڑوا ہو جائے۔

بیٹی! تم ہکّا بکّا کیوں ہو گئیں۔ کسی دوسرے کو کسی وجہ سے کمتر سمجھنا ایسی ہی بری بات ہے۔ سمندر کو تم سمجھو سماج، سماج کی خرابی دراصل یہی ہے کہ اس میں لوگ ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر سب پیارے نبیؐ کی بات پر عمل کریں اور دوسروں کو نیچا سمجھنے یا نیچے گرانے کے بدلے، ان کو اونچا اٹھائیں تو سب کیسے خوش رہیں۔"

"کیا بات فرمائی آپ نے امی!" میں بے ساختہ ساس کی تعریف کرنے لگی تو بولیں:

"بیٹی! تمام تعریف تو اللہ کے لئے ہے۔ جس نے پیارے رسولؐ کو ہماری ہدایت کے لئے بھیجا اور ان کو ہم سب کے لئے نمونہ بنایا۔ مجھے پیارے نبیؐ کی بات یاد آ گئی۔ اس میں تعریف کیا:"

"نہیں امی! آپ بھی بڑی اچھی ہیں۔"

"اگر تم مجھے ایسا سمجھتی ہو تو میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ اس نے

مجھے بڑی اچھی بہو عطا فرمائی۔"

"ایسی میں اچھی ......" میرے دل میں ساس کی قدر دونی، چوگنی، دس گنی اور بڑھ گئی۔

میں سمجھتی تھی کہ میری ساس زیادہ پڑھی لکھی تو ہیں نہیں۔ بس یہی کچھ اردو شُد بُد جانتی ہیں۔ مگر اب مجھے ایسا لگا کہ وہ علم کا سمندر ہیں۔ جی ہاں! علم کا سمندر، کیسے؟ سنئے۔

ایک دن میری سہیلیاں میرے گھر آدھمکیں۔ ساس پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ میں اپنے ساتھ کی کھیلی اور اسکول کی ساتھیوں سے باتیں کرنے لگی۔ باتوں باتوں میں صحابہؓ کے شوقِ شہادت تک بات پہنچی۔ میں اب اچھا خاصا مطالعہ کر چکی تھی۔ میں نے جنگِ تبوک کے ان شہیدوں کی تعریف شروع کر دی۔ جنھوں نے تلواروں کے سائے میں شہادت پائی تھی۔ حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت جعفر طیّارؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے کارنامے بیان کر رہی تھی۔ اتنے میں ساس تشریف لے آئیں۔

میری ساتھی لڑکیوں نے ان کو سلام کیا۔ ساس نے جواب دیا۔ پھر ادھر ادھر دیکھا۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

اس وقت کا غصہ میری سہیلیوں کو اچھا نہ لگا۔ انھوں نے کہا: "بی سلمیٰ! اب ہم چلیں۔ سنا تھا کہ تمہاری ساس بڑی اچھی طبیعت کی ہیں۔ لیکن دور کے ڈھول سہانے ہی والی مثال ہے۔"

اس طنز پر مجھے بڑا دکھ ہوا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ ساس کو اس وقت غصہ نہ کرنا چاہئے تھا۔ کیا بات ہے دو منٹ ہم مل بیٹھ کر ہنس بول لیتیں۔ پھر باتیں کیسی

اچھی ہو رہی تھیں۔ مگر سچ ہے ساس ساس ہی ہوتی ہے۔

میں یہ سوچ رہی تھی اور میری سہیلیاں جانے کے لئے کھڑی ہو چکی تھیں۔ اتنے میں ساس آئیں۔ بولیں: "کہاں چلیں؟" میری ساس نے مجھے دیکھا۔ وہ اب بھی غصے میں تھیں۔ میری سہیلیوں سے کہنے لگیں: "بچیو! تمہاری اس سگی کو توفیق نہیں ہوئی کہ تم کو چائے پوچھتی۔ میں چائے بنا رہی ہوں۔ چائے پی کر جانا۔ میں تم سے کچھ باتیں بھی کروں گی۔"

اس کے بعد میری ساس نے الماری سے ایک ڈبّہ لیا اور چلی گئیں۔ ہم سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں۔ میں سمجھ گئی۔ ساس اس بات پر خفا ہیں کہ میں نے مہمانوں کی خاطر نہیں کی۔ میری سہیلیاں پھر بیٹھ گئیں۔ لیکن اب وہ باتیں نہیں کر رہی تھیں۔ ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھیں۔ اور کچھ سوچ رہی تھیں۔ شاید سب یہ سوچ رہی تھیں کہ ساس کے مزاج کی اس وقت کی یہ تلخی بڑی میٹھی ہے اور اس وقت ساس کی پتھر نظر جس نے قریب قریب ہم سب کے شیشۂ دل کو توڑ دیا تھا۔ کلامِ نرم و نازک ہے۔

ہم سب یہی سوچ رہے تھے۔ میں مبہوت سی تھی۔ مجھ سے یہ بھی نہ ہوا کہ جا کر ساس کا ہاتھ بٹاتی۔ آخر میری ہی سکھیوں کی خاطر کے لئے تو وہ باورچی خانہ میں جا گھسیں۔

میری ساس چائے لائیں۔ کچھ میٹھا اور نمکین بھی ٹرے میں تھا۔ مجھ سے کہنے لگیں: "لے انھیں چائے پلا۔" پھر خود بھی سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو گئیں۔

میں نے لمبی سانس لی۔ چائے بنا کر دی۔ سب نے پی۔ پھر ساس پوچھنے لگیں: "یہ جنگِ تبوک کی بات کیا ہو رہی تھی؟" ہم نے بتایا کہ صحابہؓ شوقِ شہادت میں اپنی

جان کی پروانہیں کرتے تھے۔

''ہوں......'' ساس نے بڑھ کر کہا۔ پھر بولیں: میں دو باتیں کہنا چاہتی ہوں۔ تم سب سلمٰی کے ناتے میری بیٹیاں ہو۔ پہلی بات تو یہ کہ سلمٰی نے تمہاری تواضع نہیں کی۔ یہ بات اسلامی تہذیب کے سخت خلاف ہے۔ مجھے تکلیف ہوئی۔ میں سلمٰی کی طرف سے تم سب سے معافی مانگتی ہوں۔

''ہائے امی!......'' میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''مجھے معاف کر دو۔ میں باتوں میں لگ گئی تھی۔''

''باتوں میں؟ بیٹی باتیں چاہے جیسی اچھی ہوں مگر اللہ اور رسولؐ کو بھولنا نہیں چاہئے تھا۔ تم کو بتاؤں۔ ایک بار حضرت ابو بکرؓ کے گھر کچھ مہمان آئے تھے۔ وہ گھر پر نہیں تھے۔ ان کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے مہمانوں کی خاطر مدارات کی۔ لیکن بات اتنی ہوئی کہ مہمانوں کو کھانا دیر میں ملا تھا۔ بس اس پر حضرت عبدالرحمٰنؓ پر ڈانٹ پڑ گئی۔ پٹتے پٹتے بچے۔

بیٹیو! دوسری بات ذرا دھیان سے سننا۔ خدا کرے تمہاری سمجھ میں آ جائے۔ یہ جو تم کہتی ہو کہ صحابہؓ شوقِ شہادت میں اپنی جان کی پروانہیں کرتے تھے تو یہ بات سو فیصدی صحیح ہے۔ لیکن، میں ایک سو فیصدی صحیح بات اور کہتی ہوں جس کی طرف آج تک کسی نے دھیان نہیں دیا۔

تم سب نے اسلامی تاریخ پڑھی ہوگی۔ اس سے تم نے جانا کہ صحابہؓ جہاد میں شہید ہونا ساری عبادتوں سے اچھا سمجھتے تھے۔ کیوں؟ کبھی تم نے سوچا کہ ایسا کیوں

تھا۔ تم جواب دو گی کہ انھیں یقین تھا کہ شہید کو جنت ملے گی اور قیامت میں صرف قرض کا حساب اس سے لیا جائے گا اور کوئی حساب نہ ہو گا۔

اس یقین پر ہمارا ایمان ہے۔ لیکن میں ایک اور یقین کے بارے میں تم کو بتاؤں۔ صحابہ کرامؓ کو ایک اور یقین تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب وہ جہاد میں شہید ہو جائیں گے تو ان کے بعد ان کے اہل و عیال لاوارث نہیں رہ سکتے۔

سچ مچ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم دی تھی اس کا اثر یہ تھا کہ کوئی عورت چاہے وہ غریب ہو یا امیر، کنواری ہو یا بیوہ، خوبصورت ہو یا خوبصورت نہ ہو، بے شوہر کے نہیں رہ سکتی تھی۔ ادھر شوہر کا انتقال ہوا اور ادھر عدّت کے دن پورے ہوئے اور کسی نہ کسی مسلمان نے پیغام دیا۔ اس کی شادی ہو گئی۔ وہ بال بچے لے کر دوسرے مسلمان کے گھر جا بسی۔

دیکھتی کیا ہو، تم کو تعجب ہو رہا ہے۔ ہاں، بال بچوں سمیت۔ اور وہ ان بچوں کا سوتیلا باپ ان کی پوری کفالت کرتا تھا۔ آج کل کی طرح سوتیلے بچوں کی طرح ان کی درگت نہیں بنتی تھی۔

یہی واقعہ لو۔ تبوک کی لڑائی میں جعفرِ طیّارؓ شہید ہوئے۔ ان کی بیوی سے حضرت ابوبکرؓ نے بیاہ کر لیا۔ ان کے گھر بیوی بھی آئیں۔ اور حضرت جعفرؓ کا بیٹا محمد بھی۔ حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہوا تو یہی بیوی جو پھر بیوہ ہو گئی تھیں۔ حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں اور اب حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے جن کا نام بھی محمد تھا۔ حضرت علیؓ کی کفالت میں چلے گئے۔ پڑھا ہے نہ تم نے؟

اپنی بات کہتے کہتے میری ساس نے ہم سب سے سوال کر دیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ امی نے یہ بات خوب نکالی۔ اور میں ان کی سوجھ بوجھ پر دنگ رہ گئی۔ سچ پوچھو تو ان کی انہی باتوں نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ ورنہ میری زبان سے میرے میکے میں کون بچا تھا۔ اور میرے ہاتھوں سے میرے بہن بھائی پناہ مانگا کرتے تھے۔ میں یہ واقعہ بھی سناؤں کہ میں نے کب سے اپنی زبان پر تالا لگایا۔

بات یہ ہوئی کہ ایک دن فاطمہ پر میں بُری طرح خفا ہو گئی۔ میں نے اسے جھوٹا، نالائق اور نہ جانے کیا کیا بنا ڈالا۔ میں نے اسے پیٹنے کے لئے ہاتھ اٹھانا چاہا تھا۔ اتنے میں میری ساس آ گئیں۔ ان کے آنے سے میں نے ہاتھ روک لیا اور خفگی کی ہی حالت میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اب سنئے، کس طرح انھوں نے میری زبان میں تالا لگایا اور میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالیں۔

رات کو عشاء کے بعد ایک قصہ سنایا۔ ایک بار خلیفہ ہارون رشید شکار کو چلا۔ ساتھ میں وزیر، امیر، درباری لوگ اور لاؤ لشکر سب کچھ تھا۔ وہ ایک جنگل میں جا رہا تھا۔ وزیر ہارون رشید کی تعریف کر رہا تھا۔ حضور! آپ کا رعب سارے جہان پر ہے۔ اس جنگل کے جانور اور چڑیاں تک آپ سے مرعوب ہیں۔ وزیر اس طرح چاپلوسی کر رہا تھا۔ اچانک ایک جھاڑی سے آواز آئی۔ ”کہنے والا بھی جھوٹا اور سننے والا بھی۔“

ہارون رشید نے یہ سنتے ہی گھوڑا روک لیا۔ اس کے ساتھ سب رک گئے۔ اس نے جھاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ سپاہی جھاڑی سے ایک بوڑھے فقیر کو پکڑ لائے۔ ہارون رشید نے اس سے پوچھا: ”تم نے کیا کہا تھا؟“ فقیر نے جواب دیا کہ ”تم

کو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سوار پیادہ کو سلام کرے۔ تم کو چاہئے تھا کہ پہلے مجھے سلام کرتے پھر کلام کرتے۔"

ہارون رشید نے یہ سنا تو پلٹ پڑا۔ اس کے ساتھ لاؤ لشکر بھی واپس ہوا۔ راجدھانی میں پہنچ کر حکم دیا کہ اس فقیر کو حاضر کیا جائے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے خاص کمرے میں جا بیٹھا۔ اسی کمرے میں فقیر کو پہنچا دیا گیا۔ ہارون رشید نے صرف وزیر کو بیٹھا رہنے دیا اور سب کو ہٹا دیا۔ اس کے بعد فقیر کو بھی عزت سے بٹھایا۔ کھانا آیا۔ سب نے ساتھ کھایا۔ اس کے بعد ہارون رشید نے فقیر سے پوچھا: "میں ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں آپ یہ بتائیں کہ فرعون مجھ سے اچھا تھا یا مجھ سے بُرا؟"

"آپ فرعون سے اچھے ہیں کیونکہ وہ کافر تھا اور آپ مسلمان ہیں۔"

"آپ نے سچ کہا۔" اس کے بعد ہارون رشید نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کے پاس بھیجا تو یہ فرمایا کہ اس سے نرمی سے بات کرنا وہ ایک بگڑا ہوا شخص ہے۔ حضرت! میں مسلمان ہوں۔ آپ کی نظر میں بگڑا سہی، لیکن جب ایک کافر کے ساتھ قولِ لیّن (کلامِ نرم ونازک) کا حکم ہے تو کیا میں فرعون سے بھی گیا گذرا ہو گیا کہ آپ نے مجھے سارے لشکر کے سامنے پتھر سا پھینک مارا۔ میں کلامِ نرم ونازک کا حقدار تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے اللہ کے حکم کے خلاف مجھ سے سلوک کیا۔ فقیر نے اپنی غلطی مان لی۔ اور ہارون رشید سے معافی مانگ لی۔ اب ہارون رشید نے کہا: "میں سمجھ گیا کہ آپ ایک متّقی بزرگ ہیں۔ آپ کو دنیا کی ہوس نہیں۔ لیکن میرا قاعدہ ہے کہ جو میرے یہاں آتا ہے میں اسے تحفہ دیتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرا تحفہ قبول

فرمائیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک طرف دیکھا اسی وقت ایک سپاہی اشرفیوں کی دو تھیلیاں لئے ہوئے آیا اور اس نے اس فقیر کے آگے رکھ دیں۔ فقیر نے سلام کیا۔ تھیلیاں اٹھائیں، لے کر چلا۔ ادھر ہارون رشید نے وزیر کے کان میں کچھ کہا، اور خود جھروکے پر جا بیٹھا اور باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ یہاں یہ فقیر دروازے پر پہنچا۔ دروازے پر سپاہی کھڑے تھے۔ انھوں نے سلام کیا۔ فقیر نے دونوں تھیلیاں ان کو دے دیں اور ہاتھوں کو اوپر کر کے زور سے پکارا: ''اے میرے مالک! تو نے مجھے ہارون رشید اور دنیا کے مال وزر سے بچالیا۔'' ہارون رشید نے جھروکے سے اسے دیکھا اور اس کی آواز بھی سنی۔ اتنے میں وزیر واپس آیا اور بولا: ''امیر المومنین! آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ اگر یہ فقیر اشرفیاں اپنے ساتھ لے جائے تو اسے قتل کر دینا۔ وہ تو صاف بچ گیا۔ ہارون رشید نے وزیر سے کہا: ''یہ فقیر واقعی ولی ہے۔ لیکن زبان کا ذرا سخت تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اس کی اصلاح کر دی۔''

یہ واقعہ سنا کر ساس مجھ سے کہنے لگیں کہ: ''بیٹی سلمیٰ! تمہاری نند بھی اسی سلوک کی حقدار ہے۔ جاؤ، آج سے میں نے اُسے تمہاری تربیت میں دیا۔''

فاطمہ میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے اسے چمٹا لیا۔

☆☆☆

نذیرن بُوا

ممی صاحب نے بتایا کہ جب میں پہلے پہلے یہاں آئی تو گھر میں سارے کے

سارے ملازم مرد تھے۔ کلّو باورچی تھا۔ کانونیٹ اسکول میں داخل ہونے کے بعد ہندوستانی کھانا سب سے پہلے اسی نے مجھے کھلایا۔ پھر صاحب کے دوست آتے رہے۔ سب سے ملاقاتیں اور باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے ماحول کا جائزہ لیا۔ ایسا لگا کہ اس ماحول میں لوگ مسلمان تو ہیں، ان کو اسلام سے محبت بھی ہے۔ لیکن ہیں وہ سب میری طرح روایتی مسلمان۔ میں نے اسلام کے بارے میں ان سب سے بات کی تو سو کورے نکلے۔

اس ماحول میں آ کر آپ سے آپ میرے دل میں نماز سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ آپ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ آپ سے آپ کچھ نہیں ہوتا تو پھر یوں سمجھ لیجئے کہ کلّو باورچی جمعہ کے دن نماز پڑھنے جاتا تھا۔ اس دن وہ صاف ستھرے کپڑے پہنتا۔ کچھ دیر کے لئے اس پر مذہبیت طاری ہوتی۔ بڑے ادب کے ساتھ مجھ سے دو گھنٹے کی چھٹی مانگتا۔ میم صاب! میں جمعہ کی نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ میں کہتی: جاؤ۔ وہ چلا جاتا۔ تین بجے آتا تو باورچیوں کا یونیفارم پہن کر پھر باورچی بن جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ کلّو باورچی کے جمعے نے میرے دل میں نماز کی چاہ پیدا کی ہو۔

ایک دن کلّو باورچی نے مجھ سے کہا: ''میم صاب! ہمارے محلے میں ایک شخص کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی بیوی اپنی ننھی بچی کے ساتھ گھر میں رہ گئی ہے۔ اس کا کوئی والی اور وارث نہیں۔ اس کی عدّت کے دن ختم ہو گئے۔ اللہ نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے۔ آپ نذیرن کو پناہ دیں تو اللہ آپ سے بہت خوش ہوگا۔ میری زندگی میں یہ پہلا دن تھا جب میں نے کلّو باورچی سے اسلامی اخلاق کی بنیادی بات سنی۔ اس سے پہلے

میرا ذہن یہ تھا کہ ؎

بابر بہ عیش کوش کہ عالَم دوبارہ نیست

کھاؤ پیو، مزہ کرو اور مر جاؤ۔ زندگی ختم۔ میں نے سوچا کہ گھر میں کام کرنے والی ایک عورت ہو جائے گی۔ کہہ دیا کہ نذیرن کو لے آؤ۔

نذیرن بُوا تیسرے دن میرے یہاں آ گئیں۔ بستر ایک ٹاٹ میں لپٹا ہوا تھا۔ ایک بکس جس میں ان کے کپڑے، چھ برس کی ایک بچی، اس کے ہاتھ میں لوٹا، لوٹے کے اندر گلاس اور گول گول لپٹا ہوا چٹائی کے اندر ایک کپڑا سا۔ تیس برس کی جوان نذیرن بُوا، تندرست و توانا۔ سانولا رنگ، نیلی شلوار، ہرے رنگ کا جمپر اور سفید دوپٹہ۔ یہ ان کا رنگ و روپ اور لباس تھا۔ گھر میں آئیں۔ برقع اتارا۔ ایک طرف بکس اور بستر رکھ دیا۔ سامنے کلّو تھا۔ اسے سلام کیا۔ کلّو نے میری طرف اشارہ کیا۔ میں سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ نذیرن بُوا اپنی بچی کو لے کر میری طرف بڑھیں۔ میں دیکھ رہی تھی۔ پاس آئیں۔ کہا: ''السلام علیکم'' پھر بچی سے کہا: بیٹی! ممی ...... کو سلام کرو۔'' بچی نے بھی سلام کیا۔ میں ہنسنے لگی۔ میں ابھی ممی کہاں ہوں؟ نذیرن بُوا جھینپ گئیں۔ بولیں: ''اب آپ ہی میری اور میری بچی کی ممی ہیں۔ عمر میں آپ مجھ سے چھوٹی ہیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔ بڑائی تو بڑکپن سے ہوتی ہے۔ آپ نے مجھے پناہ دی۔ یہ آپ نے بھلائی کا کام کیا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ اللہ آپ سے راضی ہو۔'' پھر وہی اللہ کی خوشی اور اللہ کی رضا والی اسلامی اخلاق کی بنیادی بات جو میں نے کچھ دن پہلے کلّو سے سنی تھی۔ اب نذیرن بُوا سے سنی۔ میرے دل میں جیسے کچھ پھٹ سے ہوتا ہے نا! اس

طرح ہوا۔ دل ہی دل میں کچھ لفظ بنے۔ جو آواز نہ بن سکے۔ شاید غریبوں کے اسلام اور رئیسوں کے اسلام میں فرق ہوتا ہے۔ ایسا ہی کچھ دل نے کہا۔

میں نے نذیرن بُوا کو ایک کوٹھری دے دی۔ انھوں نے جا کر کوٹھری صاف کی۔ چھ برس کی بچی ماں کی مدد کرنے لگی۔ کوڑا کرکٹ اکٹھا کیا۔ کلّو کے پاس گئیں۔ اس سے کچھ کہا۔ اس نے کچھ جواب دیا۔ تو نذیرن بُوا نے کوڑا کرکٹ اکٹھا کر کے ایک طرف کونے میں رکھا اور ایک ٹوٹی سی ڈلیا سے ڈھانک دیا۔ پھر بچی سے کہا۔ ''بیٹی! وہ چوکے (بڑی اینٹیں) لے آؤ۔ میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔ نذیرن بُوا نے کوٹھری میں چوکوں پر اپنا بکس، بکس پر بستر رکھ دیا۔ پھر لوٹا اٹھایا۔ نل سے پانی لیا۔ ہاتھ منھ دھویا۔ وضو کیا۔ بچی نے بھی وضو کیا۔ مصلّیٰ بچھایا۔ دونوں نے دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو روہانسی سی ہو گئیں۔ مجھے بڑا ترس آرہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس غریب کو کچھ تسلّی دینا چاہئے۔ میں نے کہا: ''نذیرن بُوا، جو کچھ ہوا، بھول جاؤ، یہاں چلن سے رہو گی تو رہا ہی کرو گی۔'' بولیں: ''ممی صاب! میں آپ کے یہاں چلن سے ہی رہنے آئی ہوں۔ یہاں آپ اور آپ کے صاحب کے ہوتے ہوئے کوئی میری طرف انگلی نہ اٹھا سکے گا۔'' میرے دل میں پھر کچھ پھُٹ سے ہوا۔ شاید یہ کوئی احساس ہوتا ہے جس میں ہمدردی کی حِس ہوتی ہے۔ میں نذیرن بُوا کی بات سے دل میں بہت خوش ہوئی۔ ''اچھی عورت ہے۔'' پھر میں نے کلّو باورچی سے کہا کہ نذیرن بُوا کو وہ سامنے والی چارپائی دے دو۔''

''بس یہی کافی ہے۔'' کہہ کر نذیرن بُوا نے چارپائی اپنی کوٹھری میں بچھا دی۔

ممی صاب! ہم دونوں ماں بیٹی کے لئے یہ کافی ہے۔"

دوپہر کو صاحب آئے۔ گھر میں ایک بچی اور جوان عورت کو دیکھا۔ اس وقت وہ دونوں ظہر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ نماز پڑھ کر ماں بیٹی نے صاحب کو سلام کیا۔ صاحب نے ایک روپیہ نکالا۔ بچی کو دینے لگے۔ تو نذیرن بُوا نے کہا: "سرکار! آپ بچی کو پیسہ نہ دیجئے۔ بچی میں حرص پیدا ہو جائے گی۔ اس کے بدلے ہمیں ایک نئی چٹائی لا دیجئے۔" میں نے پہلی بار صاحب کی زبان سے "ماشاءاللہ" سنا۔ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔ "شیریں! آپ کے قدم، مبارک قدم یعنی قدم حضور کے آئے مرے نصیب کھلے۔" میں نے پوچھا: "کیا مطلب؟" بولے: "آپ نے اللہ میاں سے اچھا سودا کیا۔ ہماری بخشش کا ٹھکانہ کچھ نہ کچھ کر دیا آپ نے۔"

میں مسکرانے لگی۔ دل میں ایک خیال آیا۔ "پرائی نماز سے ہمارا کیا واسطہ؟" پھر کلّو نے کھانا لگایا۔ نذیرن بُوا غور سے دیکھ رہی تھیں۔ ہم نے کھانا کھایا۔ نذیرن بُوا دیکھ رہی تھیں۔ کلّو نے میز صاف کی۔ نذیرن بُوا دیکھ رہی تھیں۔ پھر ہم آرام کرنے کمرے میں چلے گئے۔ نذیرن بُوا اب ہمیں نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ تنہائی میں نذیرن بُوا کی کہانی میں نے سنائی۔ "اچھا کیا آپ نے، شگون اچھا ہے۔" کہہ کر صاحب نے کروٹ لی۔ پھر ہم سو گئے۔

تین بجے سو کر اٹھے۔ چار بجے چائے پی۔ صاحب اپنے کام پر چلے گئے۔ نذیرن بُوا نے یہ سب دیکھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ نذیرن بُوا اور ننھی بچی نصیرن نے باورچی خانہ میں کام کرنا شروع کر دیا۔ میں یہ سب دیکھتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ

نذیرن بُوا نے عصر کی نماز پڑھی۔ پھر مغرب کی نماز پڑھی۔ پھر عشاء کی۔ عشاء کے بعد صاحب آ گئے۔ ’’نذیرن بُوا یہ لیجئے۔‘‘ نذیرن بُوا خوشی خوشی آئیں۔ ناریل کی چٹائی اور ایک نیا مصلّٰی دیکھ کر آنکھوں سے لگا لیا۔ ’’اللہ میاں آپ دونوں کو دونوں جہانوں میں سرخرو کرے۔‘‘

ایک ہفتہ کے اندر نذیرن بُوا نے میرے گھر کی باتیں سمجھ لیں۔ اب جب میں کلّو باورچی کو پکارتی تو نذیرن بُوا حاضر ہو جاتیں۔ یہ دیکھ کر میں نے کام تقسیم کر دیا۔ کلّو باورچی کو باہر کے سودا سلف اور باورچی خانے کے بڑے کاموں کا ذمہ دار بنایا۔ اور نذیرن بُوا کو گھر کے اندر کام سونپے۔ نذیرن بُوا اس نظم سے بہت خوش ہوئیں۔ کہنے لگیں: ’’بڑی اچھی ہیں آپ۔ میں گھبرا رہی تھی کہ کہیں بازار نہ جانا پڑے۔ اور میرا پردہ ٹوٹ جائے۔ آپ نے میرا پردہ رکھ لیا۔ اللہ آپ کا پردہ رکھے۔‘‘

’’میرا پردہ؟ میں کب پردہ کرتی ہوں۔ اور تم یہ اتنا سخت پردہ کیوں کرتی ہو؟‘‘ .... ’’پیارے رسولؐ نے فرمایا ہے کہ عورتوں کو پردہ کرنا چاہیئے۔‘‘

’’کیوں؟‘‘ .... نذیرن بُوا چپ ہو گئیں۔ کیوں کا جواب ان سے بَن نہ پڑا۔ میں نے دیکھا کہ نذیرن بُوا اپنی معصوم بچی نصیرن کو اپنے ساتھ کام میں لگائے رکھتیں۔ بات بات میں، قدم قدم پر اُسے نصیحتیں کرتیں۔ بُری بات بیٹی۔ یوں نہیں، یوں، ارے توبہ! کھڑے کھڑے پانی پی لیا۔ بُری بات۔ پیارے رسولؐ نے منع کیا ہے۔ بیٹی! داہنے ہاتھ سے پانی پیو۔ پیارے رسولؐ نے فرمایا ہے۔ خبردار بیٹی! جاؤ یہ دس پیسے کا سکّہ جہاں سے اٹھایا ہے وہیں ڈال آؤ۔ پیارے رسولؐ نے گری پڑی چیز اٹھانے سے

روکا ہے۔ دیکھو بیٹی! گلاس یوں ہی ڈال دیا۔ اسے دھو کر رکھو۔ پیارے رسولؐ صفائی کو بہت پسند فرماتے تھے۔ توبہ! ناک چھنک کر انگلی نہیں دھوئی۔ بیٹی! انگلی دھولیا کرو اور دیکھو، پہلے داہنی چپل پہنو پھر بائیں۔ پیارے رسولؐ نے اسی طرح سکھایا ہے۔

اسی طرح بات بات میں، قدم قدم پر نذیرن بُوا اپنی بیٹی نصیرن سے کہا کرتیں اور بالکل اس طرح جیسے کسی سرکس میں جانور رنگ ماسٹر کے اشارے پر کام کرتے ہیں۔ معصوم بچی ماں کے اشاروں پر کام کرتی تھی۔ بار بار پیارے رسولؐ، پیارے رسولؐ سن کر ایک دن میں نے پوچھا: ''نذیرن بُوا بچی نے دس پیسے کا سکّہ اٹھالیا۔ تم نے کیوں باہر پھینکوادیا؟'' کہنے لگیں: ''ممی صاب! پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا ہے۔''

میں نے پوچھا: ''کیوں منع کیا ہے؟'' نذیرن بُوا کو 'چون و چرا' نہیں آتی تھی۔ ان کے پاس جواب صرف ایک تھا یہ کہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس لئے؟''

نذیرن بُوا جب فرصت پاتیں۔ ایک طرف اپنی بچی کو لے کر بیٹھ جاتیں یا عشاء کے بعد جب سارے کاموں سے فارغ ہوتیں۔ چارپائی پر پہنچتیں تو اپنی معصوم بچی نصیرن کو چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کراتیں۔ خود پڑھتی جاتیں۔ بچی دہراتی جاتی۔ وہ اسے بزرگوں کے قصّے اور نبیوں کی کہانیاں سناتیں۔ نذیرن بُوا کو یہ قصّے، کہانیاں ان کے مرحوم شوہر سنایا کرتے تھے۔

میں یہ بتا چکی ہوں کہ کلّو باورچی کو جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے جاتے دیکھ کر میرا

دل نماز کی طرف مائل ہوا تھا لیکن پھر وہ جذبہ دب گیا۔ نذیرن بُوا اور معصوم بچی نصیرن کی نمازوں نے جذبہ پھر اُبھار دیا۔ ایک جمعہ کے دن کی بات ہے۔ کلّو ادھر نماز کو گیا۔ ادھر نذیرن بُوا اپنی بچی کو لے کر نماز پڑھنے لگیں۔ میں صاحب کے ساتھ کمرے میں قیلولہ کے لئے گئی۔ پھر اچانک آپ سے آپ باہر آ گئی۔ نذیرن بُوا نماز پڑھ چکی تھیں۔ میں نے ان سے کہا: ''مجھے نماز پڑھا دیجئے۔'' وہ بہت خوش ہوئیں۔ دعائیں دیں۔

نذیرن بُوا نے پہلے وضو کر کے دکھایا، میں نے انھیں دیکھ دیکھ کر وضو کیا۔ پھر بُوا بڑے ادب اور نرمی سے کہنے لگیں: ''ممی صاب! پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایسے کپڑوں میں نماز نہیں ہوتی جو اتنے ہلکے ہوں کہ ان سے بدن دکھائی دے۔ عادتاً میری زبان سے نکل گیا۔ ''کیوں؟'' کہنے لگیں اس لئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ ''اچھا خیر'' میں ایک کالی چادر نکال کر لائی جس طرح نمازی عورتیں سر کو چادر سے لپیٹتی ہیں۔ بُوا نے اس طرح لپیٹنا بتایا۔ اس کے بعد وہ نماز کو کھڑی ہو گئیں۔ ان کے داہنی طرف میں اور ان کے بائیں طرف نصیرن کھڑی ہو گئی۔

نذیرن بُوا آگے آگے بلند آواز سے کہتیں۔ میں دہراتی۔ پھر جس طرح انھوں نے نماز کے ارکان ادا کئے، میں نے بھی ان کی نقل کی۔ اس پہلی نماز میں ایک خاص بات میں نے نوٹ کی۔ مجھے ایسا لگا کہ میں کانپ رہی ہوں۔ پوری چار رکعت نماز پڑھوائی۔ میں پسینے میں شرابور ہو چکی تھی۔ چادر میرے بدن پر کمبل کی طرح بوجھ بن گئی تھی۔ میں نے کہا بس اور نذیرن بُوا کی زبان سے نکلا۔ ''اللہ قبول فرمائے۔''

چادر اتار کر کمرے میں گئی تو صاحب کو جاگتے پایا۔ وہ کیمرہ کے پاس بیٹھے کچھ

دھو رہے تھے۔ میں نے کہا: ''کیا ہے؟'' کہنے لگے ابھی دکھاتا ہوں۔ کچھ دیر کے بعد جب ان کا ''وقتِ ابھی'' آیا تو ایک تصویر میرے سامنے کر دی اور فرمایا: ''یہ آپ ہیں کالی چادر میں ایسی لگ رہی ہیں جیسے کالی گھٹا میں سورج یا چاند ہو یا آسمان سے کوئی حور جھانک رہی ہو۔''

سچی بات یہ ہے کہ کالی چادر میں میرا گورا چہرہ ایسا ہی لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی تمام تصویروں کو ایک ایک کر کے دیکھا۔ میں اتنی حسین کسی تصویر میں نہیں تھی۔ صاحب نے بتایا کہ جب آپ کمرے سے نکل کر گئیں تو میں نے یہ بات غیر معمولی پائی۔ میں نے کواڑوں کی دراز سے دیکھا تو حضور والا کو اس پوزیشن میں پایا۔ بہت اچھی لگیں تو فوٹو لے لیا۔'' مجھے یاد آیا کہ کالج میں جمیلہ کالا برقع پہن کر آتی تھی۔ وہ بھی ایسی ہی لگتی تھی۔

اس دن صاحب موڈ میں تھے۔ میں نے ان سے پوچھا: ''نماز کیوں پڑھی جاتی ہے؟'' صاحب نے بتایا کہ اسلامی تھیوری میں ہر نیکی اور عبادت کا مقصد رضائے الٰہی ہے۔ نماز بھی ایک عبادت ہے۔ میں نے رضائے الٰہی اور عبادت کی تفصیل چاہی تو صاحب نے وہ جواب دیا۔ جس کی میں توقع نہیں کرتی تھی اور نہ کبھی اس طرح ان سے تبادلۂ خیال ہوا۔ میں سمجھتی تھی کہ صاحب اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے لیکن ان کا جواب سنئے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام نیکی اس کو کہتا ہے جس کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور بدی وہ ہے جس کے کرنے سے اللہ نے روک دیا ہے۔ اس کے بعد ان کی مزید تفصیل نے مجھے دنگ کر دیا۔ کہا کہ عبادت اور نیکی اگر اس لئے کی جائے کہ اللہ خوش ہوگا تو وہ عبادت ہے۔ لیکن اگر عبادت اور نیکی کرنے کا مقصد شہرت

ہو یا یہ کہ لوگ تعریف کریں تو اس کو اسلام ریاکاری کہتا ہے۔ اسی طرح برائی جیل یا بدنامی کے ڈر سے نہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اللہ کے ڈر سے چھوڑو۔

صاحب نے بات انگریزی میں کہی تھی۔ یہ وہی بات تھی جو نذیرن بُوا اپنی بولی میں کہا کرتی تھیں۔ میں نے صاحب سے کہا کہ آپ مجھے ایسی کتاب لا دیجئے جس میں نماز کے متعلق تمام باتیں مل جائیں۔ دوسرے دن جب صاحب باہر سے آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ ''فوکس آف اسلام'' اور ان کے ساتھ ایک مولوی صاحب تھے۔ کتاب دے کر مجھ سے کہا کہ نذیرن بُوا دو چار دن میں آپ کو نماز سکھا دیں گی۔ لیکن صرف نماز کافی نہیں ہے۔ باقی باتیں کچھ تو کتاب میں مطالعہ کیجئے اور کچھ مولانا سے حاصل کیجئے۔ مولانا اردو اور عربی پڑھائیں گے۔ پھر آپ خود جتنا مطالعہ کرسکیں۔

لیجئے، مولانا مجھے اردو عربی پڑھانے لگے۔ بُوا نے ایک ہفتہ کے اندر رواں کر دیا۔ لیکن ان دونوں سے زیادہ کتاب نے مجھے اسلام سے واقفیت بہم پہنچائی۔ فوکس آف اسلام پڑھ کر مجھے اپنے صاحب کے بارے میں رائے بدلنا پڑی۔ میرے دل نے کہا کہ نور ہی نور ہے اس پردۂ زنگاری میں۔

ایک دن آپ سے آپ صاحب سے سائنٹیفک بحث شروع ہوگئی۔ ابتدا یوں ہوئی کہ نذیرن بُوا کو جمائی آئی۔ میں نے دیکھا کہ انھوں نے منھ کھولا۔ اپنی بائیں پشتِ دست (بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کے دوسری طرف کا حصہ) منھ پر رکھ لیا۔ پھر انھیں چھینک آئی۔ چھینک آنے پر انھوں نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہا۔ صاحب میرے پاس کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے یَرْحَمُكَ اللّٰہ کہا۔ میں یہ سب دیکھ سن رہی تھی۔ میں

نے بُوا کو پاس بلایا۔ پوچھا کہ جمائی آنے پر ہتھیلی کے دوسری طرف کا حصہ منہ پر کیوں رکھ لیا تھا اور چھینک آنے پر اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کیوں کہی؟

نذیرن بُوا نے وہی جواب دیا جو انھیں رٹا ہوا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اسی طرح سکھایا ہے۔ بُوا سے تو میں نے کہہ دیا کہ جاؤ۔ پھر صاحب کی طرف دیکھ کر کہا کہ آپ نے یَرْحَمُکَ اللّٰہ کہا تو میں آپ سے اس کی وجہ پوچھوں تو آپ بھی یہی کہیں گے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح سکھایا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ جو بات بات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دیا جاتا ہے یہ بلا وجہ نہیں ہوسکتا۔ کیا آپ کو اس کا سائنٹیفک جواب معلوم ہے؟ آپ سے میں اِس لئے پوچھ رہی ہوں کیونکہ میرا خیال ہے آپ نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

میں نے دیکھا کہ صاحب کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ اُداس ہو گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے اُن کی کوئی قیمتی شے کھو گئی۔ جس پر انھیں افسوس ہو رہا ہے۔ بولے: ''شیریں! کیا بتاؤں، یوروپین تہذیب اپنا کر ایسا لگ رہا ہے جیسے ہیرے جواہرات چھوڑ کر ٹھیکروں پر ریچھ گیا ہوں۔ جب سے نذیرن بُوا کو دیکھا۔ کبھی کے اُن جواہرات کی چمک دمک نظروں کے سامنے گھومنے لگی، جو مجھے ورثے میں ملی تھی۔ یہ اسلام کی دولت تھی۔ میں نے اسلام کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے۔ یوروپین مفکرین کے افکار بھی میرے ذہن میں ہیں اور قرآن و حدیث کے دلائل بھی۔ لیکن یہ میری بد نصیبی ہے کہ دنیوی خواہشوں نے مجھے اندھا کر دیا۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اور سارے جہان کے رسول ؐ ڈاکٹر نہیں تھے۔ لیکن ڈاکٹری اصول کو لیجئے۔ علم طب کہتا ہے کہ جمائی

آنے پر جبڑوں کا پھیلنا ایسا عمل ہے جس میں یکدم ہوا کا دباؤ پڑنے سے کبھی کبھی منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔ زیادہ ہوا کے پاس ہونے کو ہاتھ سے روکا جاتا ہے۔ اس میں حکمت یہ دیکھئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پشتِ دست رکھنا سکھایا ہے۔ جب کہ میں کہہ چکا ہوں کہ حضورؐ ڈاکٹر نہیں تھے۔ اسی طرح چھینک آنے کے بارے میں علم طبّ کہتا ہے کہ چھینک آنے پر دماغ کی ساری چولیں ہل جاتی ہیں۔ اگر ایک سیکنڈ بھی دماغ پھر اپنی جگہ قائم نہ ہو جائے تو انسان کی موت ہو سکتی ہے۔ چھینک آنے کے بعد گویا ہمیں دوبارہ زندگی ملتی ہے۔ اس لئے مسلمان اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہتا ہے اور میں نے جویَرْحَمُكَ اللّٰہ کہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اے وہ! جسے چھینک آئی، تجھ پر اللہ نے رحم کیا، ورنہ اگر تیرا دماغ فوراً ہی اپنی جگہ قائم نہ ہوتا تو تیری موت یقینی تھی۔

شیریں! میں آپ کو بتاؤں۔ حضورؐ ڈاکٹر نہیں تھے لیکن آپ نے جو تعلیم مسلمانوں کو دی وہ بالکل سائنٹیفک ہے۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ واقعی حضورؐ اللہ کے رسول تھے اور آپ کا ہر عمل اللہ کے اشارے پر ہوتا تھا۔''

یہ سن کر میں دنگ رہ گئی۔ میری زبان سے بھی بے ساختہ صلی اللہ علیہ وسلم نکلا۔ دوسری طرف میں نے صاحب کو دیکھا۔ اُن کی آنکھوں کی دونوں جھیلیں موتیوں کی سی آب سے بھری تھیں۔ اُس وقت وہ مجھے ایسے اچھے لگ رہے تھے کہ میں نے بڑھ کر اُن کے ہونٹ چوم لئے۔ انہوں نے انگلی میرے گالوں پر لگا کر ہٹایا اور کہا: ''سنترے کا شربت پلا دو۔'' میں نے نذیرن بُوا کو پکارا تو صاحب نے فرمایا: ''ٹھیک ہے۔ مسیحا ہی کے ہاتھ سے دوا پینا ٹھیک ہے۔''

ایک دن میں نے صاحب سے کہا: ''آپ نذیرن بُوا سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں جب کہ وہ ایک جاہل عورت ہے اور آپ تعلیم یافتہ۔ اب سنئے اِس کا جواب صاحب کی زبان سے۔ فرمایا: ''شیریں! اسلام میں جاہل سب سے بڑی گالی ہے۔ جاہل اُس شخص کو کہتے ہیں جو حق بات کو حق جانتا ہے اور پھر اس کے خلاف عمل کرتا ہے اور اپنے اِس عمل پر اصرار کرتا ہے۔ اِس معنیٰ میں تو ہم خود جاہل ہیں اور نذیرن بُوا عالم ہیں۔ بیشک وہ اسلام کی تھیوری نہیں سمجھتیں۔ لیکن عمل نے اُن کو مشین بنا دیا ہے اور وہ ہمارے لئے ایسا نمونہ ہیں جسے دیکھ کر ہم اسلام کو چلتا پھرتا محسوس کر سکتے ہیں۔''

یہ سب جان کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ میں تین طرف سے اثر قبول کر رہی تھی۔ فوکس آف اسلام کتاب مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ صاحب کی وضاحتیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ نذیرن بُوا مجسم نمونہ میرے سامنے تھیں۔ نذیرن بُوا مجھ پر چھائی جا رہی تھیں۔ اب میں فرصت کے اوقات میں نذیرن بُوا کو پاس بلا لیتی اور اُن سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ بالآخر جس نتیجے پر میں پہنچی وہ یہ ہے کہ بیشک علم کا ایک مقام ہے اور بیشک علم کے بغیر کوئی خدا کو نہیں پہچان سکتا۔ لیکن عمل کے بغیر علم والے کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں۔ جس دن یہ بات مجھ پر کھلی اُسی دن سے میں نے نذیرن بُوا کو اپنا ماسٹر مان لیا۔ عجیب وغریب انقلاب جو میرے اندر ہوا وہ یہ ہے کہ اب میں بھی ہر اچھی بات کی یہی دلیل دیتی ہوں کہ اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے ایسا کرنے کو فرمایا ہے۔ ایک دن نجمہ نسرین مجھ سے الجھ پڑی۔ تو میں نے کہا: ''نجمہ! ہر کیا اور کیوں کا جواب کسی شخص کے بس کا نہیں اور یہ کہ دنیا کی لاکھوں چیزوں پر کون

ریسرچ کر سکتا ہے۔ ہمارے لئے خیر اسی میں ہے کہ ہم اللہ کے رسولؐ کو اتھارٹی مان لیں اور خاموشی سے آپؐ کی بتائی ہوئی لائن اپنا لیں۔ اس میں ہمارے لئے آسانی بھی ہے اور اسی میں بھلائی بھی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ۔

☆☆☆

ضمیر

اچھا بس کہانی ختم۔ اب جاؤ، سو رہو۔ امی جان نے کہا اور ہم سب اٹھے اپنی اپنی چارپائی پر جا لیٹے۔ سدّو بھی جا کر لیٹ گیا۔ امی بھی اپنی چارپائی پر جا بیٹھیں۔ ایک نظر ہم سب پر ڈالی اور لیٹ گئیں۔ اچانک سدّو اٹھ کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا اور امی جان کی طرف دیکھ کر بولا: ''امی جان! دیکھئے تو، ہمارے اندر بھی ایک آدمی ہوتا ہے۔'' ......''ارے واہ!'' ہم سب کی زبان سے نکلا۔ اس نے پھر کہا: ''سچ مچ امی جان! ہمارے اندر ایک آدمی ہوتا ہے۔''

دوسری بار کہا تو امی نے پوچھا: ''اس کا نام کیا ہے؟'' ......''نام تو مجھے نہیں معلوم لیکن ہوتا ہے۔'' سدّو نے جواب دیا۔

''امی! یہ یوں ہی بے سر پیر کی بات کرتا ہے۔'' صفّو باجی نے لیٹے لیٹے کہا اور سدّو جھنجھلا گیا۔ بولا: ''آج اس اندر کے آدمی نے بات کی تھی۔''

''بات کی تھی؟'' امی جان نے تعجب کے ساتھ کہا اور ہم سب بھی کبھی امی کا منہ

تکتے اور کبھی سدّو کو دیکھتے۔ ''کیا بات کی تھی:'' امی نے سدّو سے پوچھا۔

''امی! بات ایسی ہے کہ میں بتانا نہیں چاہتا آپ خفا ہوں گی۔''

''بتاؤ تو، دیکھوں بات کیا ہے؟'' .... ''چوری کی بات ہے امی!''

''چوری کی!'' اب تو ہم سب اپنی اپنی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ہم سمجھ گئے کہ آج سدّو جھوٹ بکے گا۔ لیکن بات ہوگی مزیدار۔ امی نے کہا:

''اچھا سناؤ۔ سنوں تو کیا ہوا۔ کیا تم نے آج چوری کی؟''

''نہیں امی! چوری تو نہیں کی۔ لیکن آج میرا ایمان خراب ہو گیا تھا۔''

''کیسے؟'' .... ''وہ ایسے امی! آج آپ نے تیل لینے بھیجا تھا نا! تو میں گیا۔ صدیق بھائی دوکان پر بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ایک روپیہ کا تیل دے دیجئے۔ انھوں نے مجھے تیل دیا۔ اتنے میں عصر کی اذان ہونے لگی۔ انھوں نے مجھ سے کہا: ''سدّو بیٹے! ذرا دیر دوکان پر بیٹھے رہو میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔'' .... ''امی! میں دوکان پر بیٹھ گیا۔ صدیق بھائی اٹھ کر چلے گئے۔ انھوں نے صندوقچی میں قفل بھی نہیں لگایا۔ جب انھوں نے میرا والا روپیہ صندوقچی میں رکھا تھا تو میں نے دیکھا تھا۔ صندوقچی میں ڈھیروں نوٹ تھے۔'' ''اچھا تو وہیں تیری نیت خراب ہوگئی تھی۔''

''ہاں امی! مگر سنئے تو میری نیت خراب ہوگئی تھی مگر میں نے چوری نہیں کی۔''

''تو کیسے بچ گیا؟'' ''امی جان! اسی میرے اندر کے آدمی نے بچا لیا۔''

''ارے واہ! پھر وہی بات!'' ہم سب اپنی اپنی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے سوچتے رہے۔ اب تو ہم سب کو کہانی کا مزہ آنے لگا۔ امی جان نے پوچھا: ''اس نے کیسے بچا لیا؟'' .... ''اس نے ایسے بچا لیا امی! کہ پھر وہ جو ڈھیروں نوٹ میں نے دیکھے تھے نا! تو میں نے سوچا کہ ایک مٹھی نکال کر جیب میں رکھ لوں۔ میں نے صندوقچی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی میری طرف دیکھ تو نہیں رہا ہے۔'' .... ''مگر یہ تو بھول گیا کہ اللہ میاں تو دیکھ رہے ہیں۔'' .... ''ہاں امی! یہ تو معلوم تھا لیکن اس وقت میں سب کچھ بھول گیا۔ اللہ بھلا کرے میرے اندر کے آدمی کا۔ اس نے جیسے ہی صندوقچی کی طرف میرا ہاتھ بڑھتے دیکھا، پکارا: ''سدّو! بُری بات! چوری کرنا بُری بات ہے۔'' میرا ہاتھ جھٹ سے سمٹ گیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ پاس والا دوکاندار روک رہا ہے۔ مگر اس وقت پاس والا دوکاندار اپنے گاہکوں کو سودا دے رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ پھر کس نے مجھے ٹوکا۔

میں نے سوچا کہ شاید ڈر کی وجہ سے آپ سے میرے کان بجے۔ میں نے پھر صندوقچی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ذرا سا اس کی طرف کھسک بھی گیا اچانک پھر میں نے سنا۔ ''سدّو میاں! کیا کرتے ہو۔ تمہاری امی نے بتایا ہے کہ چوری کرنا گناہ ہے۔ چوری کرنے والے سے اللہ میاں ناراض ہو جاتے ہیں۔'' .... میں پھر ڈر گیا۔ میں پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اور اب سوچنے لگا کہ یہ آواز تو میرے جسم کے اندر سے

آ رہی ہے۔" ......"کسی اور نے بھی یہ آواز سنی۔" رفّو اپیا نے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پوچھا۔......"نہ، وہ آواز ایسی تھی کہ میرے سوا کوئی سن بھی نہیں سکتا تھا۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ میرے اندر کا آدمی مجھے ٹوک کر چپ ہو جاتا تھا۔

تیسری بار میں نے دل کو پکّا کر کے صندوقچی میں ہاتھ ڈال دیا۔ اچانک میرا دل دھڑکا اور پھر میرے اندر کے آدمی نے اس زور سے مجھے ڈانٹا کہ میں کانپ گیا۔ اس نے کہا: "کیا کرتے ہو سدّو میاں! اللہ سے ڈرو۔ وہ دیکھ رہا ہے۔" ....یہ ڈانٹ سن کر میں نے صندوقچی بند کر دی۔ اپنی جگہ آ بیٹھا۔ لیکن میں بیٹھا بیٹھا کانپ رہا تھا۔ اتنے میں صدیق بھائی آ گئے۔ پوچھا: "کوئی سودا لینے آیا تھا کہ نہیں؟" میں نے جواب دیا۔ کوئی نہیں آیا تھا۔

"اچھا بیٹے! اب تم جاؤ۔" ....صدیق بھائی نے مجھ سے کہا اور میں چلا آیا۔ بس تب سے یہی سوچ رہا ہوں کہ میرے اندر ایک آدمی ضرور ہے جو مجھے بُرائیوں پر ٹوکتا ہے۔ امی جان! یہ آدمی کون ہے؟"

امی جان نے بتایا: "بیٹا! اس کا نام ضمیر ہے۔ ضمیر نام کا آدمی ہر آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ جو لوگ اس کا کہنا مانتے ہیں وہ نیک بن جاتے ہیں۔ جو لوگ بار بار اس کے ٹوکنے پر نہیں مانتے تو یہ آدمی کمزور ہو جاتا ہے اور پھر ایک دن ایسا آتا ہے جب یہ بالکل نہیں ٹوکتا۔ جب یہ نہیں ٹوکتا تو لوگوں کے دلوں سے نیکی کا خیال نکل جاتا ہے اور

وہ بُرے بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں سے اللہ میاں سدا کے لئے ناراض ہو جاتے ہیں۔ تم سب اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم سب کا ضمیر زندہ ہے۔ اچھا اب سو جاؤ۔

ہم سب پھر لیٹ گئے۔ اور نیند کی گود میں جا پہنچے۔

☆☆☆